ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"یادوں کی برات" میں عصری تاریخ

MODERN HISTORYIN YADOON KI BARAAT

منزہ رشید
حضرت عائشہ صدیقہ ماڈل ڈگری کالج، نکلسن روڈ، لاہور
ڈاکٹر مظفر عباس
پروفیسر منہاج یونیورسٹی لاہور

Abstract:

In this article, Author has discussed the historic, cultural, political and literary aspect of specific era. This trend setter autobiography "Yadoon ki Baraat" especially provide us a visionary picture of that period. The author has tried his best to light the era that is depicted in this book by analyzing comparative books.

Keywords: Urdu Language, Autobiography, language in Pakistan

"آپ بیتی" اپنی ذات اورذات سے متعلقہ احوال کے اظہار کا نام ہے۔ دیگر اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ میں اندازِ تحریر کے لحاظ سے مصنف کی ذات کا محض ایک دھندلا سا عکس ہی سامنے آتا ہے لیکن آپ بیتی میں مصنف شعوری طور پر اپنے بارے میں اظہارِ خیال کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پیش آنے والے واقعات کی صورت گری کرتا نظر آتا ہے۔

"یادوں کی برات" میں خود نوشت کے اس خصوصی پہلو سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ جوش نے کس حد تک اپنے دور کے ماحول اور تاریخ کے تناظر میں اپنی آپ بیتی رقم کی ہے اور اس کے وہ کون کون سے مظاہر ہیں جو اس لحاظ سے اسے عام بیتیوں سے زیادہ معتبر بناتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو "یادوں کی برات" حقیقتاً جوش ملیح آبادی کے عہد کی ایک ممتاز دستاویز ہے۔ یوں بھی، کسی بھی آپ بیتی کا تجزیہ ہم اس کے عہد کے تناظر کو جانے بغیر نہیں کر سکتے، اس لیے کہ خود نوشت سوانح لکھنے والا محض خود پر بیتنے والے واقعات ہی کو بیان نہیں کرتا بلکہ ان شخصیات کا ذکر بھی از خود (فطری انداز میں) لازم ہو جاتا ہے جن سے لکھنے والے کا تعلق رہا ہو۔ پھر اس کے عہد کا ماحول، سیاسی اثرات، سماجی رویے، باہمی تعلقات، زندگی کی ناکامیوں اور کامیابیوں میں پیش آنے والے حالات وحادثات اوران کے محرکات، سب کچھ از خود ایک لازمۂ حیات کے طور پر رقم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی اس خود نوشت کے شروع میں سماجی، مذہبی، ادبی، سیاسی اوراپنے خاندان کے حوالے سے اس وقت کے ہندوستان بالخصوص لکھنؤ کے حوالے سے کچھ جزئیات کو پیش کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب معاشی اور سیاسی سطح پر ہندوستانی مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں پس ماندہ رہ گئے تھے۔ اگرچہ معاملہ صرف ہندوؤں اور ہندوستان میں بسنے والی دوسری اقوام کے ساتھ صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہ تھا، ہندوستان کی اجتماعی حالت بدیسی راج کی وجہ سے غلامانہ ذہنیت کی حامل تھی اور بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی راج نے پورے ہندوستان پر اپنے پنجے گاڑ لیے تھے جس کے اثرات دور تک پہنچے اور پورے ہندوستان میں برطانوی حکومت کا یہی طرزِ عمل تھا کہ عوام کے مقابلے میں جاگیرداروں، زمینداروں اور رجعت پسندوں کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ جاگیر دار بھی چوں کہ محکوم طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے انگریزی حکومت انہیں بھی شبہے کی نظر سے دیکھتی تھی مگر جب بھی عوام میں مخالفت کی لہر اٹھتی تو دونوں وقتی طور پر متحد ہو جاتے تھے۔ یہ جاگیر دار یا والیان ریاست بے انتہا بزدل ہوتے تھے۔ ان کی ریاستوں میں بد نظمی اور بے ایمانی کا دور دورہ ہوتا اور خود انگریزی حکومت بھی عوام الناس کو محکوم رکھنے کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے کا سبب بنتی تھی۔ دراصل انگریزی حکومت کی یہ پالیسی عام تھی کہ اپنے چنیدہ لوگوں کو جاگیریں عطا کر کے انہیں جاگیر داری کے منصب پر فائز کر دیتی تھی اوران کے ذریعے جو ظلم وستم محکوم عوام پر روا رکھے جاتے تھے، ان کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

پشت پناہ پر برطانوی حکومت ہی تھی۔ ہندوستان کے دیہی علاقے یہاں تک کہ شہر کا غریب طبقہ بھی ان جاگیرداوں کے تسلط سے آزاد نہ تھا جس کے نتیجے میں عام طبقے کی معاشی حالت قابلِ رحم بن چکی تھی اور وہ ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے بھی انتہائی پس ماندگی کا شکار ہو چکے تھے۔

"یادوں کی برات" میں جن حالات و کوائف اور ادبی ماحول کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے، اگر اس عہد کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ خود نوشت ہمیں اس ماحول سے آشنا کرتی ہے جو ہماری تاریخ کا ایک اہم ترین موڑ ہے۔ جوش ملیح آبادی کے ابتدائی دور پر نظر دوڑائی جائے تو مختلف سیاسی تحریکوں کے زیرِ اثر ہندوستان کا برطانوی دورِ حکومت آخری دموں پر تھا۔ ہندوستان میں جس سیاسی شعور کی لہر پیدا ہوئی تھی، اس کو سر سید احمد خان نے ایک نئے انداز اور وقت کی ضرورت کے تحت کچھ اور تیز کر دیا تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ سر سید نے اس لہر میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ علی گڑھ کالج کا قیام، مسلمانوں کے لیے انگریزی تعلیم کا بندوبست محض اس لیے تھا کہ مسلمان نوجوان جدید تعلیم حاصل کر کے اپنا کھویا ہوا تشخص حاصل کر سکیں اور وقت کی ضرورت کے مطابق انہیں آگہی مل سکے۔ چناں چہ اس کے نتیجے میں آزادی کا جو نیا ولولہ بیدار ہوا، اس سے مسلمانوں کی مختلف علمی و ادبی، انجمنوں اور اداروں کے قیام کے ساتھ برطانوی راج سے آزادی کی نئی تحریکوں نے جنم لیا۔ قبل ازیں ایک جانب علی گڑھ تحریک تھی جس نے تعلیم و تمدن کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا اور دوسری جانب وہ سیاسی تحریکیں تھیں جن میں اساطین ملت نے اپنے افکار سے جذبۂ حریت بیدار کیا۔ شبلی، حالی، اکبر، جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر کئی اساطینِ ملت کی عوامی و علمی سطح پر کاوشیں ہندوستانی مسلمانوں کی مردہ ذہنیت میں ایک نیا جذبہ پیدا کر رہی تھیں۔

جوش نے شدتِ تفاخر میں جس جاگیردارانہ کرّوفر کا نقشہ پیش کیا ہے، وہ دراصل انگریزی حکومت ہی کے سیاسی احسانات کے ساتھ وجود میں آیا تھا، تاہم خاندانی کرّوفر کا احساس انہیں ہمیشہ رہا اور خود نوشت لکھتے وقت وہ یہ بالکل بھول گئے کہ جن آسائشوں اور لذتوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں وہ ایسے جابرانہ سماج کی آئینہ دار تھیں جنہیں محض خرافات اور برطانوی دور کی غلامانہ ذہنیت کا حامل سمجھا جا سکتا ہے اور جس "فرنگی سے نفرت" کا اظہار انہوں نے "یادوں کی برات" کے ایک باب میں واقعات کی افسانہ تراشی سے کیا ہے، اس غلامانہ ذہنیت کی پرورش اسی فرنگی نے کی تھی۔

اسی دور میں ایک جانب علامہ اقبال کی شاعری اس غلامی کے خلاف اپنا احتجاج رقم کر رہی تھی بلکہ غلامی کے اصل رازوں سے پردہ اُٹھا رہی تھی اور مسلمانانِ ہند کو خودی اور خود آگہی کی تعلیم سے بہرہ یاب کر کے انہیں "ذوق یقیں" کی منزل سے آشنا کر رہی تھی تو دوسری جانب اقبال کی شاعری کے ردِ عمل میں "ترقی پسند تحریک" اپنے بال و پر سنوارنے میں لگی ہوئی تھی۔ جب کہ جوش کا تو مطمحِ نظر ہی مذہب کو مطعون کرنا تھا اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ انہوں نے اقبال کی شاعرانہ روح کو بالکل نہیں سمجھا اور سطحی اندازِ نظر سے اقبال کو ہدفِ تنقید بناتے رہے۔

اگرچہ "یادوں کی برات" کی ابتداء میں جوش ملیح آبادی نے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت اور برطانوی حکومت میں جنم لینے والے بعض سماجی و سیاسی سانحات پر بھی روشنی ڈالی ہے تاہم ایک شاعر کی خود نوشت کے طور پر "یادوں کی برات" کا تحریری مقصد اس عہد کی تاریخ مرتب کرنا نہیں تھا، بلکہ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور اپنی شاعرانہ شخصیت کو نمایاں کرنا مقصود تھا جس میں ان کا نظریۂ فن بھی سامنے آتا ہے اور دیگر مذہبی اور تاریخی شخصیات کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر بھی۔ "یادوں کی برات" میں جس عہد کی تصویر کشی ہے، وہ پورے طور پر جیتا جاگتا ہمارے سامنے عیاں ہے۔ انہوں نے صرف اپنے سوانح اور ادبی تعلقات کی روشنی میں اس عہد کی بعض نمایاں کے شخصی خاکے بھی مرتب کیے ہیں، البتہ ذاتی حالات کے تناظر میں جزوی طور پر اس دور کے، سماجی، سیاسی اور فکری خدوخال بھی عیاں ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی خود نوشت کو تحریر کرنے کے لیے اپنی یادوں کو مجتمع کرتے ہوئے جس کرب سے گزرتے ہیں، اس کے اظہار میں بھی ۱۸۵۷ء کے خوں چکاں المیے کا ذکر شدت سے کرتے ہیں، ابتدائی باب کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

> "کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں ایک بوڑھے میرزا صاحب رہتے تھے جنہوں نے حضرت جانِ عالم واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھی تھیں، ایک بار چند نوجوانوں نے اصرار کیا کہ میرزا صاحب قبلہ کچھ پرانے حالات سنائیے۔ انہوں نے سینہ پیٹ کر کہا، لڑکو مجھ سے وہ داستان نہ سنو، ورنہ میری چھاتی شق ہو جائے گی، تمہاری تھوڑی دیر کی دل چسپی ہو جائے گی اور میں پہروں کے لیے بیکار ہو کر رہ جاؤں گا، لیکن جب ان نوجوانوں نے ان

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

کے قدم پکڑ لیے تو ماضی کی طرف پلٹنے پر مجبور ہو گئے اور حالات سناتے سناتے، تھوڑی دیر میں اُن کا یہ عالم ہو گیا کہ گلا رُندھ گیا، ہچکیاں لے لے کر رونے لگے اور 'ہائے جانِ عالم' کہہ کر بے ہوش ہو گئے۔ سو، بندہ پرور اپنا حال سنا کر، میں بھی اسی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہوں، ہائے ماضی کے ڈنک!۔" [۱]

ہندوستان کی تاریخ کے اگر اس حصے پر نظر ڈالی جائے تو دہلی پر نادر شاہ درانی کے حملے اور بے دریغ قتل وغارت گری کے بعد یہ دوسرا بڑا سانحہ اہلِ دہلی پر گزرا بلکہ ہندوستان کے بے شمار علاقے اس سانحے کی زد میں آئے۔ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی حکومت اور صوبہ اودھ میں واجد علی شاہ کی حکومت، شاہ عالم ثانی کے بعد کے ہندوستان میں محض کٹھ پتلی حکومتیں تھیں جب کہ اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ کی عیاشیوں نے عوام الناس کو بھی مبتلائے ہوس بنا دیا تھا جس سے عسکریت کی روح فنا ہو کر رہ گئی تھی۔ جاگیرداروں اور نوابین اودھ کی عیاشیاں کسی آنے والے خطرے سے بے نیاز، عروج پر تھیں۔ نتیجتاً جب ۱۸۵۷ء میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوا تو انگریزوں نے آخر کار ایک جانب واجد علی شاہ کو قید کر کے کلکتہ بھیج دیا، دوسری جانب دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی اولاد، شہزادے شہزادیوں کو سرِ عام قتل کیا گیا اور دہلی کے باشندوں پر ایسے ایسے ظلم ڈھائے کہ قیامت سے پہلے قیامت کا منظر دکھائی دینے لگا۔ یہی سلوک صوبہ اودھ کے ساتھ روا رکھا گیا اور لکھنؤ کے بازاروں اور محلوں میں قتل وغارت کا وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ خدا کی پناہ۔ یہی وجہ ہے کہ جوش نے جس بوڑھے شخص کی ذہنی کیفیت کو، جو "واجد علی شاہ کی آنکھیں دیکھ چکا تھا"، پیش کیا ہے، ماضی کی ایک الم ناک یاد کے طور پر بیان کیا ہے مگر جوش کا کمال یہ ہے انہوں نے کسی تاریخی روداد کو پیش کرنے کے بجائے، علامت کے طور پر اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ماضی کی الم ناکی کو بیان کرنا کس قدر دشوار ہے۔ [۲]

"یادوں کی برات" کا یہ اہم ترین پہلو ہے کہ جوش نے شدتِ جذبات اور قوتِ اظہار کو کہیں بھی ماند نہیں پڑنے دیا۔ سیاسی المیہ ہو یا ذاتی، ہر موقع پر ان کے ہاں یادوں کی برکھا ایک رثائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ یہ رثائی کیفیت ان کے پُر شکوہ اندازِ بیاں میں بعض جگہ دھیمی پڑتی دکھائی دیتی ہے مگر بین السطور ان کے دلی الم کو اجاگر ضرور کرتی ہے۔ خود نوشت کے اٹھارہ معاشقوں میں بھی جہاں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا، وہاں ان کا بیانیہ ان کی غم ناکی کا بیان ضرور رکھتا ہے مگر شکوہِ الفاظ کے باعث قاری ان کی عبارت کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ آپ بیتی کا یہ انداز جوش کے ہاں دیگر آپ بیتیوں سے یکسر مختلف اور اپنا خاص آہنگ رکھتا ہے۔ جس طرح ان کی شاعری میں شکوہِ الفاظ کا طنطنہ ہے، نثر میں بھی انہوں نے اسی شکوہ کو زندہ رکھا ہے جس نے ان کی آپ بیتی کو چیزے دگر بنا دیا ہے۔

"یادوں کی برات" کا ایک حصہ "میرے چند قابلِ ذکر احباب" اور "میرے دور کی چند عجیب ہستیاں" کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ دوستوں میں جن لوگوں کی شخصیات پر جوش نے اظہارِ خیال کیا ہے ان میں جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے لے کر حکیم آزاد انصاری، مانی جائسی، وحید الدین سلیم، مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، فانی بدایونی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی اور مصطفےٰ زیدی جیسے چند شعرا اور سردار روپ سنگھ، دیوان سنگھ مفتون، مولانا عبد السلام، مولانا عبد اللہ عمادی، نواب رفیع احمد خاں، مولانا سہابھوپالی اور وصل بلگرامی جیسی چند شخصیتوں کے خاکے بھی شامل ہیں۔ یہاں اجمالاً ایک دو کا ذکر کرتی ہوں۔

اپنی پسندیدہ شخصیات کے ضمن میں جوش نے سروجنی نائیڈو کا ذکر بھی کیا ہے۔ سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظمیں انگلستان میں بھی کافی مقبول ہوئیں۔ آپ نے اُردو اور بنگالی زبان میں بھی شاعری کی۔ موسیقی میں کافی دل چسپی رکھتی تھی اس لیے آپ کو ہندوستان کے لوگ "بلبل ہند" کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ کو گاندھی جی کی ایک خاص "نائب" معتمد کی حیثیت سے امتیاز حاصل تھا۔۔۔ ۲۹۔۱۹۲۸ء میں مہاتما گاندھی نے سروجنی نائیڈو کو اپنا نمائندہ بنا کر امریکہ بھیجا تھا۔

جوش نے اپنی آپ بیتی میں سروجنی نائیڈو کا جگہ جگہ مبالغہ آرائی کی حد تک ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف میں آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ "سروجنی نائیڈو" کے باقاعدہ خاکے میں لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"بادۂ شاعری سے سرشار، گردِ شعر اکی غم گسار، آزادی کی شیدائی، محبت کی شہنائی، لہجے میں ارغنوں، باتوں میں افسوں، میدانِ جنگ میں جھانسی کی رانی۔۔۔ بلبلِ ہندوستان، اگر یہ دور مردوں میں جواہر لال اور عورتوں میں سروجنی کی سی ہستیاں پیدا نہ کرتا تو پورا ہندوستان نابینا ہو کر رہ جاتا۔"۳

آپ بیتی میں جوش ملیح آبادی موقع بے موقع پنڈت جواہر لال نہرو کا ذکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں ذکر تو سروجنی نائیڈو کا ہو رہا ہے مگر پنڈت صاحب کی رطب اللسانی میں بھی ان کا قلم بے اختیار ہو جاتا ہے۔

شیخ عبد اللہ "آتش چنار" میں پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہ اپنے آپ کو ناستک کہتے تھے لیکن وہ ہندوستان کے اس ماضی کے عاشق زار اور قصیدہ خواں تھے جس میں ہندو احیا پرستی اور ہندو افسوں کا راج بھی تھا۔۔۔ وہ اپنی ذات کو اس قدیم سلطنت کے پھر سے قائم و دائم کرنے کا ایک ہتھیار Instrument سمجھتے تھے ۔۔۔ جواہر لال نے یہ سیاست کاری کشمیر میں ہمارے ساتھ برتی، پاکستان کے ساتھ بھی برتی اور بین الاقوامی سطح پر ہنگری اور دوسرے معاملات میں بھی اس کا مظاہرہ کیا۔"۴

پنڈت نہرو کے متعلق مذکورہ شخصیت کی آرا اور جوش کی بیان کردہ خوبیوں والے جواہر لال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جواہر لال کے متعلق ذکر اس تعریفی انداز: "اے لافانی جواہر، روح انسانیت کا سجدہ قبول کر"۵ سے انہیں دنیا سے الگ صفات والی مخلوق قرار دیا جا سکتا ہے۔

جوش نے ٹیگور کے حوالے سے "یادوں کی برات" میں جہاں ان کی شاعری کی تعریف کی، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھتے گئے کہ:

"ایک چیز اُن میں ایسی تھی جو میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو بُری نظر سے دیکھا کہ جب کوئی غیر ملکی انٹرویو کے واسطے ان سے ملنے آتا تھا، تو اس کے آنے سے پیش تر، وہ بن سنور کر ایک نمایاں مقام پر بیٹھ کر جاتے تھے۔ عود اُن کی پشت پر سلگا دیا جاتا تھا اور وہ حسین لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑا کر کے یوں انٹرویو دیا کرتے تھے کہ آنے والے کو یہ گمان ہونے لگے کہ میں کسی پُر اسرار دیوتا کو دیکھ رہا ہوں۔"۶

جوش کی آپ بیتی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ یہ اپنے زمانے کی مذہبی، سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی حالات کو بھی پیش کرتی ہے۔ "یادوں برات" میں جوش نے لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے لباس کے متعلق لکھا ہے:

"ہمارے یہاں ایک طرف تو لکھنؤ کی دُپلی ٹوپیاں، ململ اور ریشم کے کڑھے کرتے، شربتی انگرکھے، سلمٰے ستاری کی رضائیاں، مخمل کے لحاف، چوک کا عطر، قنوج کا تیل پھلیل اور مشروکے کے پایجامے راہ پا گئے۔"۷

لکھنؤ کے کھانے بھی اپنی مثال آپ تھے جہاں لباس میں نفاست پسندی کا دخل تھا وہاں رنگا رنگ اور لذیذ کھانوں میں لکھنؤ کا جواب نہ تھا۔ جوش نے اس زمانے کے لذیذ کھانوں کا ذکر اپنی آپ بیتی میں تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"عبد اللہ کی دکان کی پوریاں کچوریاں، احمد کی باقر خوانیاں، سعادت کی شیر مالیں، شبراتی کے اٹھارہ اٹھارہ پرتوں کے پراٹھے، جھمن رکاب دار کے بھنے ہوئے مرغ، شاہد کا بیڑوں کا پلاؤ۔۔۔ حسین آباد کی بالائی وغیرہ لوگوں کے پسندیدہ کھانے شمار ہوتے تھے۔"۸

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

لکھنؤ میں امیرانہ کھانوں ی خصوصیات شاہانِ اودھ کی فارغ البالی، دولت کی ریل پیل اور "زندگی برائے خوردن" کے مصداق تھیں۔ عبدالرزاق کانپوری نے شاہان اودھ کے دستر خوان کی جو تفصیلات رقم کی ہیں، خاصی دل چسپ ہیں۔ مثلاً:

> "لکھنؤ کے باورچیوں نے کھانے کی نفاست کو بڑھایا اور غذا کے وزن کو گھٹایا۔ انہیں یہ کمال حاصل تھا کہ پانچ سیر غذا کا جوہر پاؤ بھر میں نکال لیتے تھے اور ۲۴ سیر گوشت کی مقطر یخنی میں ایک سیر پلاؤ دم ہوتا تھا اور یہی نواب صاحب کی غذا تھی۔ چناں چہ خاصے کے پلاؤ کا ایک لقمہ دوسروں کے لیے جمال گوٹے کا جُلاب ہو جاتا تھا ۔۔۔ ان مقوی غذاؤں کے ہضم کرنے کے لے آب دار خانے میں طبی اصول سے پانی بھی تیار ہو جاتا تھا۔ ورنہ معمولی پانی دل و جگر میں آگ پھونک دیتا تھا اور سب سے بڑا یہ کمال تھا کہ بعض اوقات ایک ہی چیز سے (نمکین ہو یا شیریں) جملہ کھانے تیار کر دیتے تھے۔ چناں چہ واجد علی شاہ کے باورچی نے دہلی کے ایک شاہزادے کو دھوکہ دینے کے لیے پلاؤ، قورمہ ترکاریاں، شیرمال تک سب کھانے شکر سے تیار کیے تھے اور پھر لطف یہ تھا کہ ہر کھانا اپنی اصلی صورت میں نظر آتا تھا۔"۹

امیرانہ کھانوں کے عام ذوق نے اودھ میں اس فن کو بھی بہت ترقی دی، چناں چہ لکھنؤ کے بازاروں میں نفیس ترین نہاری، کباب، باقرخانی، شیرمال عموماً دکانوں پر ملنے لگیں اور ان کی شہرت دور و نزدیک کے شہروں میں ہو گئی۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی میں لکھنؤ کی تہذیب کے ہر پہلو کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ جب انگریز پورے برصغیر پر قابض ہو گئے تو دو تہذیبیں تھیں، یعنی مشرقی اور مغربی تہذیب۔ دونوں میں فرق واضح کرتے ہوئے جوش نے اس وقت کے تئرات کو یوں قلم بند کیا ہے:

> "شام ہوتے ہی نوابوں اور رئیسوں کے محلوں میں جھاڑ فانوس، شمعیں اور اِسکے روشن کر دیے جاتے ۔۔۔ معطر حقے اور سگیں گڑگڑاتیں۔ ادھر کلبوں میں تاش کھیلے جاتے، بیڈمنٹن کی اچھل کود ہوتی، پیانو بجتا، گراموفون کھڑکھڑاتا، سگرٹوں کی بُو اڑتی۔"۱۰

جوش نے ہندوستان کی اپنی مشرقی اقدار اور مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تحت ایک قسم کی تہذیبی کشمکش کی صورتِ حال دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پرانی قدروں کے لیے ان کا احساسِ تفاخر بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی وضاحت میں اس وقت کے لوگوں کے وضع قطع کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ

> "خالص مشرقی قسم کے لوگ چہروں پر لمبی اور خشخشی داڑھیاں رکھتے تھے۔ سروں کو ڈھانپنے کے لیے پٹے اور ان پر عمامہ رکھتے تھے۔ پاؤں میں گھتلے یا سلیم شاہی جوتے ۔۔۔ ہاتھوں میں خاک شفا کی تسبیح رکھنا، اُنگلیوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں پہننا پسند کرتے تھے۔"۱۱

مردوں میں پسند کیے جانے والے لباس اور اشیاء کے ساتھ عورتوں کے بناؤ سنگھار میں اس دور میں پہنے جانے والے زیورات کا ذکر بھی جوش نے خوب کیا ہے۔ یہ بھی تہذیب کا ایک جزو ہے۔ جس میں سر پر چھپکا، ماتھے کا ٹیکا، کانوں میں پتے، بالیاں۔ جھمکے، بالے، مگر، بندے، جھالے، انتیاں اور کرن پھول، ناک کی نتھنی، گلے میں پہنے جانے والا طوق، گلوبند، بدھی، زنجیر، چنن ہار، دھکدکی چمپاکلی اور پاؤں میں پہننے والے چھلوں ۱۲ کا ذکر کر کے اس دور کی تہذیب کو بیان کیا ہے۔

لوگوں کے رہنے سہنے اور استعمال میں آنے والے فرنیچر اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کا ذکر خوب انداز میں کرتے ہوئے جوش رقم طراز ہیں:

> "گھروں میں مغربی فرنیچر کا کہیں نام نہیں تھا۔ وہی پرانے وضع کی مسہریاں، وہی چھپر کٹ، نیچے پایوں کے تختوں کے چوکے، چوکوں پر مسندیاں، قالین، چاندنیاں، گاؤتکیے، میز پوش کا رواج عام تھا۔"۱۳

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

کھیلیں بھی کسی معاشرے کی تہذیب کا اہم جزو ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں کھیلے جانے والے کھیلوں میں ہندوستانی کھیل یعنی گلی ڈنڈا، پتنگ، آتی پاتی، آنکھ مچولی، ست گھڑا، گپل، گولیاں، اندھا مرغا، لنّی گھوڑی، شطرنج، تیراکی، بانک، بنوٹ، پٹا، کشتی، ڈنڈا اور مگدر، مرغ بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی کا عام رواج تھا۔ جن کا ذکر جوش نے آپ بیتی میں کیا ہے۔

تہذیب کے عناصر اور پہلوؤں کو جوش نے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ سفر کے دوران پلیٹ فارم کا منظر اور گہما گہمی کی تفصیل اس انداز سے جوش نے بیان کی ہے گویا سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ بیان کرتے ہیں:

> "الامان والحفیظ ۔۔۔ چار باغ کی طوفاں بدوش وقیامت درآغوش ہلچل، گہما گہمی، دھکا پیل، انفرادی، نفسانفسی، چیخ وپکار، گاؤں کہار، الالاہٹیں، گھبراہٹیں، ریل پیل، ۔۔۔ دوڑتے ٹھیلوں کی جگر خراش گھڑگھڑاہٹیں، قلیوں کی، مسافروں کے اڑاٹے، خوانچے والوں کا شوروغوغا، ٹکٹ چیکروں، پولیس والوں، ریلوے افسروں۔۔۔ ہزاروں سیٹیوں کی آوازیں، دھوئیں کے لچھے۔۔۔"[۱۴]

جوش نے جہاں تہذیب کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں موسموں کا ذکر بھی خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ گرمی کے موسم سے ہر کوئی نڈھال پریشان ہوتا ہے۔ اپنے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے گرمی کے زور کو کم کرنے کے لیے خس کی ٹٹی اور ہاتھ سے جھلنے والے پنکھوں کے متعلق بتایا ہے۔ ان دنوں ایک عام رواج تھا کہ شام کے وقت صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تاکہ گرمی کی حدت کم ہو سکے۔

اپنے بچپن کی گرمی کے موسم میں مزید اراور ٹھنڈک پہنچانے والے مشروبات کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

> "ہم سب بھائی بہن تختوں کے چوکوں اور آرام کرسیوں پر آکر بیٹھ جاتے اور تاڑ کے بڑے بڑے پنکھے حرکت کرنے لگتے تھے۔ تربوزوں اور خربوزوں کی قاشوں، بالائی کی قلفیوں اور آب خوروں، نمش کے تھلوں اور فالودے کے برف میں جھلے گلاسوں سے، ہم سب کی ضیافت کی جاتی تھی اور رات کو بڑے سے آنگن میں ہم سب کے پلنگ اُونچے اُونچے کھمبوں پر لٹکے ہوئے جھالر دار پنکھوں کے نیچے بچھا دیے جاتے اور علاقے سے، باری باری آنے والی عورتیں صبح تک پنکھوں کی ڈوریاں کھینچا کرتی تھیں۔"[۱۵]

برصغیر میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک ہندو اور دوسری مسلم قوم۔ دونوں قومیں اپنے اپنے مذاہب کے مطابق اپنے تہوار مناتیں۔ دونوں قوموں کے مذاہب کو اس دور میں جیسے منایا جاتا تھا، جوش نے اپنے بچپن کے زمانے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے شبِ برات کی تفصیل میں، جب پھلجھڑیوں، گولوں، غباروں، پٹاخوں، نونٹوں اور اناروں کے پھوڑنے سے شبِ برات منائی جاتی تھی، تکرارِ لفظی کے خوب صورت آہنگ میں ذکر کیا ہے کہ:

> "طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ شائیں شائیں، غائیں غائیں، غوں غوں، سرسراہٹ، دھم دھم دھماک ۔۔۔ دور دور تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جایا کرتا تھا۔"[۱۶]

جوش کے ہاں رمضان کے روزے رکھنے کا رواج نہ تھا اور ان کے بہ قول اسلام کے نام پر تن من دھن قربان کر دینے پر ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن اعمال کے لحاظ سے رئیس زیادہ اور مسلمانی بس نام کی تھی۔

رمضان المبارک کے ذکر کے بعد عید کے چاند کو دیکھنے کے رواج کے متعلق بھی بتایا ہے۔ عید کا چاند دیکھنے کی خوشی ہر کسی کے دل میں ہوتی ہے۔ جوش اپنے زمانے میں عید کا چاند دیکھنے کی باقاعدہ رسم کا ذکر کرتے ہیں کہ اس وقت لوگ ضعیف الاعتقاد تھے کہ اگر چاند دیکھنے کے فوراً بعد جس عورت پر نظر پڑے، وہ خوش قسمت ہے ورنہ کسی ہرے بھرے درخت یا پھول کو دیکھ لیتے یا آرسی میں اپنے چہرے ہی کو دیکھ لیا جاتا تھا۔ یہی خیال بچوں کے متعلق تھا کہ اگر کوئی خوش قسمت نہیں تو سارا سال بُرا ہی گزرے گا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

عید کے چاند دیکھنے کی باقاعدہ رسم کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے جوش لکھتے ہیں کہ:

"گھر کی تمام بیبیاں، چاند دیکھنے کی تمنا میں جمع ہو جاتی تھیں اور چاند نظر آتے ہی سب جھٹ سے آنکھیں بند کر لیتیں، ہات اُٹھا اُٹھا کر زیرِ لب دعائیں مانگتیں --- پھر ایک دوسرے کے منہ پر چاند دیکھا کرتی تھیں۔"۱۷

جوش نے اِن تہواروں کے ذکر میں اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ پُرانی تہذیب کی نمائندگی ہو اور وہ اس بات میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

برصغیر میں چوں کہ ہندو مسلم دونوں تہذیبیں تھیں اس لیے جوش نے مسلم تہواروں کے ذکر کے ساتھ ہندو تہواروں کی تفصیلات بھی پیش کی ہیں، لہٰذا ہولی کا ذکر کرتے ہوئے جوش نے اس تہوار کو منانے میں جن اشیاء کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، وہ جوش کی مشاہداتی انفرادیت ہے۔

ہولی سردیوں کے اختتام پر منائی جاتی ہے۔ فروری مارچ کے چند ہی دن دراصل فراغت کا وہ وقفہ ہیں جب کسان کے پاس تفریح اور ہنسی مذاق کے لیے کچھ وقت ہوتا ہے۔ مرد عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر رنگ چھڑکتی ہیں۔ جگہ جگہ عبیر اور گلال کی بارش ہوتی ہے اور گلی کوچے رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

جوش نے اپنے زمانے کی ہولی کا منظر کچھ یوں بیان کیا ہے:

"ہولی کھیلنے کا بہت پہلے اہتمام کیا جاتا تھا ہر سال نئی پچکاریاں بنوائی جاتی تھیں، بڑی بڑی دیگوں میں رنگ بھرا جاتا تھا اور ایسی پچکاریاں چلتی تھیں کہ ہم سب کے کپڑے شرابور اور گھر کے تمام در و بام رنگین ہو جایا کرتے تھے۔"۱۸

جوش نے لکھنؤ کی تہذیب کے تمام خدوخال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے برسات، گرمی، ہولی، رمضان، شب برات، عیدین کے ذکر کے ساتھ اس دور کی تہذیب و ثقافت کو عیاں کیا ہے، انہوں نے "محرم" کا ذکر بھی اتنی ہی تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے محرم کی تعظیم میں لکھنؤ کے حالات کو قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام بہو بیٹیاں اور مامائیں، اصیلیں تک زیور بڑھا دیتیں، پان کھانا ترک کر دیتیں اور سیاہ لباس پہن لیا کرتی تھیں--- ہمارے امام باڑے میں رات کے نو بجے دادی کی قیادت میں ماتم ہوتا تھا جس میں میری ماں بہنیں وغیرہ کے علاوہ ملیح آباد کی شیعہ سیدانیاں اور مغلانیاں بھی شریک ہوا کرتی تھیں۔"۱۹

لکھنؤ کی ثقافت (عیش و نشاط کے حوالے سے) طوائفوں کے ذکر کے بغیر ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ جوش نے جب آنکھ کھولی تو اسی ماحول کو اپنے اردگرد پایا۔ اس وقت لکھنؤ میں اودھ کی تہذیب زوال کا شکار تھی، اس لیے ذریعۂ عزت شاعری ہی رہ گئی تھی۔ علوم و فنون سے منہ موڑ کر ظاہر پرستی، خود نمائی اور آرام طلبی کو تہذیب کا نام دیا جاتا تھا۔ حقیقت پر مبنی بات ہے کہ کسی خاندان کے ایک یا زیادہ بزرگ جدوجہد کرتے ہیں اور جو کچھ کماتے ہیں ان کی آئندہ نسلیں ان میں اضافہ کیے بغیر اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں، یہاں تک کہ دولت اور نام دونوں کے نشان ختم ہو جاتے ہیں۔ لکھنؤ کے اکثر طبقات رفتہ رفتہ اس زوال و ادبار کا شکار ہو چکے تھے، فارغ البالی عام تھی جس کے نتیجے میں شاعری ہر شخص کے مزاج میں داخل ہو چکی تھی۔ شرفاء اپنے محلوں میں مشاعرے منعقد کرواتے اور تہذیب کے نام پر وہ سامان مہیا رکھتے، جن پر نظر ڈالتے ہی شعر کہنے کو جی چاہے۔ ان شرفا کا مشغلہ بٹیروں، مرغوں، کبوتروں، کنیزوں، لونڈیوں کو پالنے کے ساتھ ساتھ شاعروں کا خیال رکھنا بھی تھا۔

جہاں تک جمال پرستی کا تعلق ہے، وہ اودھ کے لیے اس حد تک مخصوص ہو گئی تھی کہ عورتوں سے میل جول کی باتوں کو عیب تصور نہیں کیا جاتا تھا اور عورت ہر صاحبِ ثروت کی زندگی کا جز بن گئی تھی۔ لکھنؤ کے گلی کوچے مینا بازار بن گئے اور لکھنؤ حسین عورتوں سے معمور ہو گیا۔ ہر طرف اربابِ نشاط اور زنان بازاری کے چرچے عام تھے۔ موسیقی کو اس قدر عروج حاصل ہو چکا تھا کہ دوسرے علاقوں کی نسبت اس فن سے اہلِ لکھنؤ کا لگاؤ کئی گنا زیادہ تھا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

جوش کے زمانے میں بھی طوائفوں کے ساتھ رنگ رلیاں عروج پر تھیں، تاہم اب انہیں تہذیب وثقافت پر ایک بہت بڑا داغ سمجھا جانے لگا جس پر نئے دور کے زعمانے کچھ اصلاحات کی جانب توجہ کی اور اس کلچر کا قلع قمع کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش نے اپنے آپ کو ثقافتی تہذیب کے نمائندے کے طور پر پیش کیا اور اپنی آپ بیتی میں ان ثقافتوں کا ذکر کر کے ان کو ہمیشہ کے لیے زندہ و محفوظ کر دیا ہے۔

جوش نے اپنی آپ بیتی میں اس دور کی سیاسی تاریخ کو بھی بیان کیا ہے۔ تاریخ کا جائزہ لینے سے قبل انیسویں صدی کے آخر کے پس منظر کو مدِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے نتیجے سے کسی نہ کسی صورت سبھی متاثر تھے۔ انگریزوں کی برصغیر میں مکمل حکومت قائم ہو چکی تھی اور نو آبادیاتی نظام کو مضبوط کرنے کے لیے سیاسی وانتظامی اقدامات مکمل ہو چکے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا کانگریس وجود میں آئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے دل کی بھڑاس اس پلیٹ فارم پر نکال لیا کریں لیکن آخر کار کانگریس کی تاریخ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک کی تاریخ بن گئی۔

جوش نے جس دور میں ہوش سنبھالا، وہ انقلاب کا دور تھا۔ سیاسی اُتار چڑھاؤ کا شور ہر طرف سنائی دے رہا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۹ء) کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ سیاسی جدوجہد، جو اَب تک تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے تک محدود تھی، اس کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ جرمنی، آسٹریلیا اور خصوصاً انقلاب روس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ذہن پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ان کی معاشی بے چینی بہت جلد سیاسی بے چینی میں تبدیل ہوتی گئی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کا ذرہ ذرہ بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سیاسی آزادی سے معاشی آزادی کے معنی لیے جانے لگے۔ ۱۹۴۵ء کے وسط میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی اور ان مصیبتوں کا آغاز ہوا جو جنگ کے بعد نظر آتی ہیں، یعنی اقتصادی اور معاشی مسائل وغیرہ۔ جنگ کے خاتمے نے اس سوچ کو جنم دیا کہ آئندہ انسانی فائدے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۵ء میں ایک ادبی مشاعرے میں شرکت کے لیے جوش پاکستان آئے۔ بہ قول جوش ان کے ایک پرانے دوست سید ابو طالب نقوی (چیف کمشنر کراچی) پاکستانی شہریت کے سلسلے میں جوش سے اصرار کرتے رہے لیکن جوش پاکستان مستقل آمد کے لیے انکار پر مصر تھے۔ جوش نے اس کا ذکر آپ بیتی میں یوں کیا ہے:

> "میں نے کہا نقوی صاحب جب تک پنڈت جواہر لال نہرو زندہ ہیں، میں پاکستان کیوں کر آ سکتا ہوں۔۔۔ انہوں نے کہا، شاعر کی یہ بڑی بد بختی ہے کہ وہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی جذبات کی ترازو میں تولا کرتا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر نہرو صاحب آپ کی زندگی میں سدھار گئے، تو پھر ہندوستان میں آپ کا چاہنے والا کون رہ جائے گا، آپ کی یہ نوکری آپ کی یہ فراغت وعزت، کیا ان کے بعد ختم نہیں ہو جائے گی؟ اور تھوڑی دیر کے واسطے یہ بھی فرض کر لیجیے کہ پنڈت نہرو کے بعد بھی ہندوستان آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے رہے گا لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ خدانہ خواستہ، آپ کے بعد وہاں آپ کے بچوں کا کیا حشر ہو گا؟۔۔۔ جوش صاحب آپ کے بچے اُردو بھول جائیں گے، ہندی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گی۔ وہ آپ کے کلام کا ترجمہ ہندی میں پڑھیں گے۔"[۲۰]

آخر کار جوش نے پاکستانی شہریت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۵۶ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ پاکستان میں انہیں خصوصی مراعات دی گئیں مگر وہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے پاکستان میں غیر مطمئن ہی دکھائی دیتے رہے۔

جوش جس وقت ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آئے، پاکستان کے حالات اور جمہوری زاویۂ نظر ہندوستان کے بالکل برعکس تھا، یعنی ۱۹۵۶ء میں مارشل لاء کے تحت فوجی حکومت قائم تھی اور یہ پہلی مارشل لاء حکومت ایسی سخت گیر تھی کہ ادیب وشاعر تو درکنار کسی سیاسی اور عوامی لیڈر میں بھی چوں کرنے کی ہمت نہ تھی۔ چند سال بعد ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت کے بعد دوسرا مارشل لاء آ گیا۔ ظاہر ہے اس حالت میں خاموش رہنے کے سوا کسی بھی انداز سے کچھ کہنے کی گنجائش یا زبان کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ "یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

"میرے چند کلماتِ حق کو سُن کر حکومتِ پاکستان کے ماتھے پر شکن پڑ گئی تھی اور اس وقت کے صدر "فیلڈ مارشل ایوب خاں بہادر" کی خسروانہ خرمستی، ان کے کفش بردار الطاف گوہر کی غلامانہ دراز دستی اور الطاف گوہر کے پرستار شان الحق کی سفیہانہ باطل پرستی، مجھے اور میرے تمام خاندان کو درماندگی کے بحرِ ذخّار میں دھکیل کر بڑی بے حیائی کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دے رہی تھی۔ اگر اس وقت بھیم جی، نوحؑ کی کشتی بن کر مجھے اس طوفانی سمندر سے باہر نہ لے آتے تو میرا کیا حشر ہوتا۔"۲۱

پشاور ٹی وی سنٹر سے کسی عزیز نے یہ اطلاع دی کہ خبر نامے میں بتایا گیا کہ جوش کو بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔ بلیک لسٹ کا مطلب یہ تھا کہ ان کے کلام کی نشر و اشاعت پر پابندی لگا دی جائے اور ایسا ہی ہوا۔ بہ قول فرخ جمال ملیح آبادی:

"ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں معتوب ٹھہرائے جانے کے بعد جوش کے قریبی رفقا جن پر جوش کو بہت ناز تھا، ملنے سے کترانے لگے، شاید اس وجہ سے کہ کہیں وہ بھی حکومت کی نظروں میں نہ آجائیں۔"۲۲

جوش نے اپنے عہد کے سماجی، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی حالات کو جس خوبی سے پیش کیا ہے اُنہی کا کمال ہے۔ اُنہوں نے اپنے عہد کے نقوش کو صفحات پر اس لیے منتقل کیا تاکہ آنے والے مؤرخین کو ان کے عہد کی تاریخ مرتب کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

الغرض جوش نے لکھنؤ کی تہذیب، مخصوص معاشرت، تاریخ، تمدن، سیاست اور رسوم و رواج، سب کچھ آپ بیتی میں سمو دیا ہے اور اس کاوش میں کام یاب نظر آتے ہیں کہ انہوں نے قاری کو اس دور کی مٹتی ہوئی تہذیب کو اپنے تناظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی اپنی مشرقی قدروں اور مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تحت ایک قسم کی تہذیبی کشمکش کی صورتِ حال دکھانے کی کوشش کی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" کی صورت میں ایک پورے عہد کو تہذیبی علامت کے طور پر خود نوشت کے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے۔

حواشی

۱۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، دہلی، شانِ ہند پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴

۲۔ واجد علی شاہ کی عیاشیوں کے بے شمار ایسے پہلو ہیں جنہیں بیان کرتے ہوئے قلم شرمندہ ہو جاتا ہے۔ دربار میں ایک سو ایک عورتیں جو یقینی طور پر سب کی سب غیر منکوحہ تھیں، لونڈیوں کی طرح رکھی ہوئی تھیں اور ان پر پہرے داری کے طور پر زبردستی کے بنائے ہوئے خواجہ سرا مقرر تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ ان لونڈیوں پر کوئی اور شخص تصرف حاصل نہ کر سکے۔

میاں محمد افضل لکھتے ہیں:

"نواب واجد علی شاہ نے خوبصورت اور کم سن عورتوں پر مشتمل ایک زنانہ فوج تیار کی تھی، جس کی پلٹنوں کے نام 'اختری' اور 'نادری' وغیرہ تھے اور یہ سب کام انگریز ریذیڈنٹ کے سامنے ہو رہے تھے۔ خوش حالی نے زندگی کے متعلق لذت پرستانہ فلسفے کو جنم دیا اور سب لوگ عیش و عشرت میں غرق ہو گئے۔ عیاشی کی یہ حالت تھی کہ اودھ کے غرقِ لذت نوابوں کی عورتوں کی تعداد ایسے گنوائی جاتی تھی جیسے شاہی اصطبل میں گھوڑیاں شمار کی جاتی تھیں، چھوٹی سی مثال ہے کہ نواب شجاع الدولہ کے وسیع و عریض حرم میں ستائیس سو سے زیادہ عورتیں تھیں۔" (تاریخ زوال امت، میاں محمد افضل، دہلی، ملی پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۲۷۔۳۲۸)

۳۔ یادوں کی برات، ص ۵۲۵

۴۔ عبداللہ، شیخ، آتشِ چنار، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، س۔ن، ص ۴۲۴

۵۔ یادوں کی برات، ص ۵۲۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۰۲

۷۔ ایضاً، ص ۳۰

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.4 2021

۸۔ ایضاً، ص۸۹۔۹۰

۹۔ عبدالرزاق کانپوری، یادِ ایام، حیدرآباد (دکن)، عبدالحق اکیڈمی، ۱۹۴۶ء، ص۵۴

۱۰۔ یادوں کی برات، ص۱۸۴

۱۱۔ ایضاً، ص۱۸۵

۱۲۔ ایضاً، ص۱۸۶

۱۳۔ ایضاً، ص۱۸۸

۱۴۔ ایضاً، ص۸۶

۱۵۔ ایضاً، ص۶۵

۱۶۔ ایضاً، ص۷۴

۱۷۔ ایضاً، ص۷۶

۱۸۔ ایضاً، ص۷۱۔۷۲

۱۹۔ ایضاً، ص۸۰

۲۰۔ ایضاً، ص۲۷۸۔۲۷۹

۲۱۔ ایضاً، ص۵۵۹

۲۲۔ فرخ ملیح آبادی، جوش ملیح آبادی، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء، ص۷۷